اقبال اور اردو

مرتضیٰ اختر جعفری

مرزا غالب پر تنقید کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے ایک بڑا خوب صورت فقرہ لکھا ہے کہ ''مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں یہ تین نام لوں گا غالب، اردو اور تاج محل'' اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی دو سو سال کی مسلسل جدوجہد آزادی نے ہمیں کیا دیا تو میں بے اختیار یہ تین نام لوں گا اقبال، پاکستان اور اردو اور ان تینوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ایسا گہرا ربط ہے جو کسی صورت میں بھی جدا نہیں کیا جا سکتا اردو اور پاکستان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں پاکستان کی بقا اور سلامتی کے لے اردو کا پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے رائج ہونا بے حد ضروری ہے کیونکہ اردو نے پاکستان بننے سے پہلے غیر منقسم ہندوستان میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے اور اس کے استقلال کے لیے جو جدوجہد کی وہ کوئی پوشیدہ بات نہیں اور پھر پاکستان بننے کے بعد دہلی کی گلیاں اور لکھنو کے کوچے چھوڑ کر لاکھوں مہاجروں کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئی، یعنی اس مظلوم نے پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، لیکن پاکستان میں آج تیس سال گزر جانے کے باوجود بھی اس کو اس کا اصلی مقام نہ مل سکا۔

جہاں تک پاکستان اور اقبال کا ایک دوسرے سے ربط ہے، اس کے بارے

میں میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی اقبال وہ شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے پاکستان کا واضح تصور پیش کیا اور مسلمانان برصغیر کی بقا و فروغ کی خاطر ان کے لیے ایک الگ مملکت قائم کر کے اس میں اسلام کی بنیادوں پر نظام چلانے کا خواب دیکھا۔

اقبال اور اردو کا تعلق اتنا اہم اور گہرا ہے کہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر تصور کرنا ناممکن ہے پاکستان بننے سے پہلے بھی پنجاب کا دارالخلافہ لاہور اردو زبان و ادب کا مرکز رہا ہے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں زندہ دلان لاہور نے اردو زبان و ادب کی جو خدمات سرانجام دیں ان کی ایک تاریخی حیثیت ہے، اور خاص طور پر شیخ سر عبدالقادر کے یادگار رسالے ''مخزن'' کی وساطت سے اردو زبان کی جو لافانی خدمت ہوئی اس کی نظر نہیں ملتی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کو ان کے ابتدائی ادبی دور میں لوگوں سے متعارف کرانے کا سہرا بھی ''مخزن'' کے سر ہے چنانچہ اس سلسلے میں سر عبدالقادر ''بانگ درا'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں

''لاہور میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی جس میں مشاہیر شریک ہونے لگے اور نظم و نثر کے مضامین کی اس میں مانگ ہوئی شیخ محمد اقبال نے اس کے ایک جلسے میں اپنی وہ نظم جس میں ''کوہ ہمالیہ'' سے خطاب ہے، پڑھ کر سنائی اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں اس رپ خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی مذاق، زمانہ اور ضرورت وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی اور کئی طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے، مگر شیخ صاحب یہ

عذر کر کے کہ ابھی نظر ثانی کی ضرورت ہے اسے اپنے ساتھ لے گئے اور وہ اس وقت چھپنے نہ پائی اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ادب اردو کی ترقی کے لیے رسالہ ''مخزن'' جاری کرنے کا ارادہ کیا اس اثنا میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات پیدا ہو چکی تھی میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اس رسالہ کے حصہ نظم کے لیے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا کہ میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی انہوں نے کہا ابھی تیار نہیں میں نے کہا ''ہمالہ'' والی نظم دے دیجئے اور دوسرے مہینے کے لئے کوئی اور لکھیے انہوں نے اس نظم کو دینے میں پس و پیش کی کیونکہ انہیں یہی خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں مگر میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بہت مقبول ہوئی اس لیے میں نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل 1901ء میں نکلا شائع کر دی یہاں سے گویا اقبال کی اردو شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا۔''

اقبال کو اردو زبان و ادب سے بے انتہا محبت تھی وہ اپنے زمانے میں بھی اس زبان کو ایک اونچی مسند پر دیکھنا چاہتے تھے اور جب اس بے چاری کو بے توجہی کا شکار دیکھا تو اپنی ایک نظم میں جو انہوں نے مرزا غالب کے بارے میں لکھی تھی، اس زبان کی زبوں حالی اور آشفتگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی، دل سوزی، پروانہ ہے

ان کے نزدیک شمع اردو کو روشن رکھنے اور اسے جلا بخشنے کے لیے پروانوں کی

ضرورت ہے کیونکہ ہر شمع کی رونق اس کے پروانوں کی تعداد پر ہوتی ہے اس بات کو مدنظر رکھ کر اقبال نے گیسوئے اردو خود بھی سنوارے اور دوسروں کو بھی ان کے سنوارنے کی طرف متوجہ کیا اقبال کی نظم و نثر کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی کتاب ''اقبال اور قومی زبان'' میں لکھتے ہیں:

''ان کے اردو کلام نے جس میں فکر و نظر کی وسعت اور شعریت و تغزل کا حسین امتزاج ہے اردو میں اظہار و بیان کے اعلیٰ ترین پیرائے پیدا کیے۔ شاعری کے علاوہ اقبال نے اردو زبان کی ایک اور اہم خدمت بھی انجام دی جس کا جائزہ پوری طرح نہیں لیا گیا یہ اقبال کی علمی نثر ہے۔''

اقبال کی اردو زبان سے محبت کا ایک ثبوت اس خط سے بھی ملتا ہے جو انہوں نے سید نصیر الدین ہاشمی کے نام مئی 1925 کو تحریر کیا تھا جب سید نصیر الدین ہاشمی نے اپنی مشہور کتاب ''دکن میں اردو'' ان کو بھجوائی تو اس کتاب کے مطالعے کے بعد جو خط لکھا، اس میں لکھتے ہیں:

''دکن میں اردو، نہایت مفید کتاب ہے، خصوصاً اس کا پہلا حصہ جو میں نے نہایت غور سے پڑھا ہے اردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ کے لیے جس قدر مسالہ ممکن ہو جمع کرنا ضروری ہے غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہوگئی تو مورخ اردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے''

اقبال کی یہ آرزو بھی پوری ہوئی اور ایک دانش ور مولانا محمود شیرانی نے ان کی اس خواہش کو پورا کیا اور بقول علامہ اقبال کے پنجاب میں جو پرانا مسالہ موجود تھا

اس کو جمع کیا اور ''پنجاب میں اردو'' جیسی عظیم کتاب تالیف کی۔

اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لیے اقبال ہمیشہ ہمہ تن آمادہ رہے جس کا ثبوت اقبال کے اس خط سے جو انہوں نے مولوی عبدالحق کے نام 27 ستمبر 1936ء کو لکھا تھا ملتا ہے مولوی عبدالحق نے اقبال کو اردو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علامہ اقبال اکثر بیمار رہا کرتے تھے، لیکن اس علالت کے باوجود جن الفاظ میں انہوں نے مولوی صاحب کے خط کا جواب دیا ان کی اردو کے ساتھ محبت اور عقیدت کا زندہ ثبوت ہے لکھتے ہیں:

''بہر حال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہو گیا تو انشاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانیے کہ اس اہم معاملے میں کلیتہ آپ کے ساتھ ہوں اگر چہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔''

یہاں اقبال نے جو عصبیت کا لفظ استعمال کیا وہ تعصب کے معنوں میں نہیں اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار فرماتے ہیں:

''عصبیت اور تعصب دو الگ الگ کیفیتوں اور مختلف معنوں کے حامل ہیں اپنی میراث سے محبت کا جذبہ، صادق عصبیت کہلاتا ہے اور دوسروں کے خلاف بلا وجہ نفرت وحقارت کا جذبہ تعصب کہلاتا ہے اس لیے عصبیت جہاں مستحسن ہے وہاں تعصب مذموم''

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی اس وضاحت سے، کہ عصبیت اپنی میراث سے محبت کے جذبہ، صادق کو کہتے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اردو کو اپنے بزرگوں کی

میراث سمجھتے ہیں اور اس میراث میں ہمیشہ اضافے کے خواہاں تھے اور اکثر اپنے دوست، احباب اور متعلقین کو اس زبان کی خدمت کی طرف توجہ دلائی۔

اس خط میں آگے چل کر علامہ اقبال تمنا کرتے ہیں کہ اردو کی ترقی اور مقبولیت کے لیے پنجاب کو مرکز بنانا چاہیے اور اس کے لیے دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''یہاں کے لوگوں میں اثر قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہے سادہ دل صحرائیوں کی طرح ان میں ہر قسم کی باتیں سننے اور ان سے متاثر ہو کر ان پر عمل کرنے کی صلاحیت اور مقامات سے بڑھ کر ہے۔''

28 اپریل 1938ء کو اقبال نے اپنی موت سے فقط ایک سال پہلے مولوی عبدالحق صاحب کو خط لکھتے ہوئے اس آرزو کا اظہار کیا ہے:

''کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا، لیکن افسوس! ایک علالت پیچھا نہیں چھوڑتی، دوسرے بچوں کی خبر گیری اور ان کی تعلیم و تربیت کا فکر افکار دامن گیر ہیں۔''

اقبال اردو کو اس کا جائز مقام دلوانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے ان کا منشا تھا کہ کس طرح اردو برصغیر کی زبان کے طور پر رواج پائے اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کے نام 8 اکتوبر 1938ء کو ایک خط تحریر کرتے ہیں جس میں لکھنو میں مسلم لیگ کے جلسے میں اردو کے بارے میں قرارداد منظور کرانے کی تجویز پیش کرتے ہیں فرماتے ہیں:

''میں نے سنا ہے، لیگ کی طرف سے آپ کو بھی لکھنو آنے کی دعوت دی گئی ہے براہ عنایت اس سفر کی زحمت ضرور گوارا فرمائیے اردو کے متعلق اگر لیگ کے

کھلے سیشن میں کوئی مناسب قرارداد منظور ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کا اثر بہت اچھا ہوگا۔''

اقبال کی اردو ادب اور زبان سے بے انتہا محبت اور عقیدت کے حال کا اس بات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اردو کے دیرینہ شیدائی مولوی عبدالحق کو اردو زبان و ادب کی خدمت کی قدر شناسی کے صلے میں الہ آباد یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی اس خبر سے علامہ اقبال کو بے حد خوشی ہوئی اور الہ آباد یونیورسٹی کے اس اقدام کو نہایت مستحسن قرار دیا یونیورسٹی کو قابل مبارک باد گردانتے ہوئے اپنے 23 ستمبر کے خط میں لکھتے ہیں:

''الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری آپ کو مبارک ہو حقیقت یہ ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی نے آپ کی قدر شناسی کر کے اہل ہنر کی نگاہوں میں خود کو مستحق مبارک باد کرلیا ہے اس واسطے آپ کو مبارک باد دیتے ہوئے میں الہ آباد یونیورسٹی کو ان کی نکتہ شناسی پر مبارک باد دیتا ہوں۔''

اردو زبان و ادب کی ایک زمانے تک خدمت کرنے اور اشعار کے مجموعے تخلیق کرنے کے باوجود فروتنی اور کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ جون 1921ء میں ایک شخص ماسٹر طالع محمد نے جلال پور جٹاں ضلع گجرات پنجاب سے خط لکھ کر دریافت کیا:

''جب الفاظ عربی یا فارسی سے اردو میں منتقل ہوتے ہیں تو بعض اوقات اردو میں آن کر تلفظ بدل جاتا ہے۔۔۔۔۔ مگر بعض باریک بین اور نفاست پسند حضرات اصل زبان کے تلفظ کو اردو میں خواہ مخواہ ٹھونسنے پر ادھار کھائے ہوئے ہیں

اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اصل زبان کے تلفظ کو صحیح تصور کیا جائے یا وہ تلفظ صحیح ہے جو اہل زبان (دہلوی اور لکھنوی ادیب یا ان کا خواندہ طبقہ) استعمال کرتے ہیں؟''

ماسٹر طالع محمد کے اس خط کے جواب میں میں سمجھتا ہوں کہ حضرت علامہ اقبال ان کو صحیح تلفظ بتا سکتے تھے، کیونکہ ان کی عربی اور فارسی کی استعداد کسی سے کم نہیں تھی، لیکن بجائے خود جواب دینے کے ان کو اس دور کے عظیم علما سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جس قسم کی تحقیق زبان آپ کو مطلوب ہے، افسوس کہ میں اس میں آپ کی کوئی امداد نہیں کر سکتا غالباً لکھنو سے آپ آدھ رسالہ مرزا یاس عظیم آبادی ایڈیٹر، کار امروز، لکھنو اور مرزا عزیز لکھنوی، اشرف منزل لکھنو، سے خط و کتابت کریں وہ آپ کو صحیح مشورہ دے سکیں گے میں آپ کی قدر و منزلت کرتا ہوں کہ اس زمانے میں اور ایسے مقام پر آپ کو صحیح اردو کا ذوق ہے۔''

اپنے وطن سے دور غیر ملک میں جب کسی اجنبی کو اپنی زبان میں باتیں کرتے سنا جائے تو کتنی خوشی اور کتنی تقویت ہوتی ہے سر احساس غرور سے بلند ہو جاتا ہے اور اپنی زبان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

جب علامہ اقبال نے سفر انگلستان کے دوران سویز کی بندرگاہ عدن پر ایک مصری دکان دار کو اردو بولتے ہوئے سنا تو بے حد خوشی کا اظہار انہوں نے اپنے ایک دوست محمد دین فوق کے نام ایک خط میں کیا جو انہوں نے 25 نومبر 1905ء کو کیمبرج سے لکھا لکھتے ہیں:

''ایک نوجوان مصری دکاندار سے میں نے سگریٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں اس سے کہا کہ میں مسلمان ہوں، مگر میرے سر پر چونکہ انگریزی ٹوپی تھی اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ (تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا جب وہ میرے اسلام کا قائل ہو کر یہ جملہ بولا تم بھی مسلم ہم بھی مسلم، تو مجھے بڑی مسرت ہوئی)''

اقبال محض مسلمانوں کے ایک قومی شاعر نہ تھے بلکہ فاضل ایک ایسی شخصیت تھے جن کی اپنی قومی زبان اردو کے ادب پر گہری نظر تھی شیخ اکرام صاحب نے جب اپنی کتاب ''غالب نامہ'' آپ کو بھیجی تو اس کے تنقیدی مطالعے کے بعد شیخ صاحب کو 12 مئی 1938ء کو جو خط لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے مرزا غالب کی شاعری کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کی شاعری کی نزاکتوں سے بخوبی واقف تھے، بیدل کی تقلید میں غالب کے ہاں جو خامیاں نظر آئیں، ان کی طرف بھی اس خط میں اشارے ملتے ہیں اپنے اس خط میں ''غالب نامہ'' کی تعریف کی اور کتاب میں شیخ اکرام کے جن آرا سے اتفاق نہیں کیا تھا صاف صاف لکھ دیا فرماتے ہیں:

''عنایت نامے اور کتاب کے لیے۔۔۔۔۔شکریہ قبول فرمایئے آپ نے مقدمہ کی تیاری اور غالب کی تاریخ وار نظموں کی ترتیب میں محنت و کاوش سے کام لیا ہے بلاشبہ آپ نے غالب پر ایک نہایت عمدہ تصنیف پیش کی ہے اگرچہ مجھے آپ کے چند نتائج سے اتفاق نہیں میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ حضرت غالب کو اردو نظم میں بیدل کی تقلید میں ناکامی ہوئی غالب نے

بیدل کے الفاظ کی نقالی ضرور کی، لیکن بیدل کے معانی سے اس کا دامن تہی رہا بیدل کا رہوار فکر اپنے ہم عصروں کے لیے ذرا گریزیا تھا۔''

1903ء میں ملک کے بعض اخبارات اور رسائل میں اہل پنجاب کی اردو پر اعتراضات ہو رہے تھے ان میں خاص طور پر علامہ اقبال اور خوشی محمد ناظر کی شاعری اور زبان کو اعتراضات کا نشانہ بنایا جا رہا تھا ان معترضین میں میر ممتاز علی ایڈیٹر'' تالیف و اشاعت'' اور ایک شخص انبالوی صاحب اور ایک دوسرے حضرت جو اپنے نام کے بجائے ''تنقید ہمدرد'' لکھتے تھے، پیش پیش تھے۔ ان لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں حضرت علامہ اقبال نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ ارشادات اردو ادب کے مستقبل کے لیے ایک نیک فال ثابت ہوئے علامہ صاحب اپنے مقالے ''اردو زبان پنجاب میں'' جو اکتوبر 1906ء کے ''مخزن'' میں چھپا تھا، ارشاد فرماتے ہیں:

''آج کل بعض اخباروں اور رسالوں میں اہل پنجاب کی اردو پر بڑی لے دے ہو رہی ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس بحث کے فریق زیادہ تر ہمارے نئے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں ادھر ایک صاحب ''تنقید ہمدرد'' جو اخلاق جرأت کی کمی یا کسی نامعلوم مصلحت کے خیال سے اپنے نام کو اس نام کی نقاب میں پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں، ناظر اور اقبال کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے پنجابیوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ ادھر ہمارے معزز و محترم دوست میر ممتاز علی ایڈیٹر، تالیف و اشاعت، اور انبالوی صاحب اپنے محققانہ مضامین سے اپنی وسعت خیال کا ثبوت دیتے ہیں ہمارے دوست ''تنقید

ہمدرد'' اس بات پر مصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو مروج ہونے سے بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو، لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے۔۔۔ جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات اور الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع کیے جا رہے ہوں اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے ابھی کل کی بات ہے، اردو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کیے بغیر نہیں رہے علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔''

ان کوتاہ اندیشوں کے تعصب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے چل کر فرماتے ہیں:

''تعجب ہے کہ۔۔۔۔۔۔ فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے کو بلا تکلف استعمال کرو، لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پر معنی پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اس کو کفر و

شرک کا مرتکب سمجھو۔ اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم اور محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے۔''

اس تمام لے دے کے بعد جو سراسر دشمنی اور عناد پر قائم تھی علامہ اقبال نے اپنی کشادہ دلی اور وسیع مشربی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے خوب صورت انداز میں بحث کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ کے مضمون سے میری طبیعت تحقیق کی طرف مائل ہوئی، اور کیا تعجب ہے کہ میرا جواب آپ کی طبیعت پر بھی اثر کرے آپ مطمئن رہیں مجھے اساتذہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہے اگر اہل پنجاب مجھ کو یا حضرت ناظر کو بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں، تو ان کی غلطی ہے، زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے کہ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے قسم بخدائے لایزال میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور کم مائیگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں، ورنہ مجھے زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔''

رقم مشہدی میرے دل کی بات کہتے ہیں:

نیم من در شمار بلبلاں اما باین سارم
کہ من ہم در گلستان قفس مشت پرے دارم

☆☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006